Vol. 4 No. 1 (2026)

Liberal Journal of Language & Literature Review
Print ISSN: 3006-5887
Online ISSN: 3006-5895
https://llrjournal.com/index.php/11

مابعد جدید نظم مابعدنوآبادیاتی تناظرمیں

Postmodern Nazm in a Postcolonial Context

Dr. Uzma Noreen*

Lecturer Urdu Department G.C Women University Sialkot

uzma.noreen@gcws.edu.pk

Liberal Journal of Language & Literature Review
Print ISSN: 3006-5887
Online ISSN: 3006-5895

DOI: http://doi.org/10.5281/zenodo.21718863

Abstract

This paper presents a study of Postmodern Urdu Nazm in a postcolonial context and examines how colonial influences persisted even after political independence at the intellectual, cultural, economic and civilizational levels and how Urdu Nazm gave poetic expression to these influences. Postmodern Urdu poetry is generally viewed in terms of ambiguity, internalization, linguistic experimentation, symbolism and stylistic innovation, however, postcolonial consciousness also holds a very important position in its intellectual and historical background. Issues such as identity crisis, cultural alienation, political oppression, cultural monopoly, global imperialism, internal colonialism, economic exploitation and consumerism come to the fore in this poetry.
The research has attempted to clarify that modern colonialism maintained its hegemony in new forms through economic, cultural, intellectual and informational means rather than traditional political occupation. Global capitalism, consumer culture, media and Western cultural influences have affected the local languages, cultural values and collective identity of third world societies, which has been reflected in postmodern Urdu poetry in the form of various poetic symbols, metaphors and stylistic experiments. In this context, the inner anguish of the postmodern poet is not just a personal feeling but also a symbol of a broader collective and cultural crisis.
The article also makes it clear that the concept of resistance in postmodern Urdu Nazm is not limited to political protest but is also associated with cultural self-awareness, recovery of identity, preservation of local culture and the desire for human freedom. Therefore, reading postmodern poetry in a postcolonial context makes its hidden political, cultural and historical meanings more clear. The main conclusion of the research is that postmodern Urdu Nazm is a sensitive poetic reaction against colonial heritage, global imperialism and contemporary cultural crisis, which connects the inner anxiety of the individual with collective history, cultural memory and resistance consciousness.

***Keywords**: Postmodern Urdu Nazm, Intellectual, Cultural, Economic, Civilizational, Poetic symbols, Metaphors, Stylistic experiments.*

Introduction

معاصر جدید اردو نظم کے مطالعے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ مابعد جدیدیت کے ابتدائی آثار و مظاہر کی شناخت بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں کی جا سکتی ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اردو ادب میں جدیدیت اپنی فکری اور فنی معراج کو پہنچ چکی تھی۔ ہر ادبی تحریک کی طرح جدیدیت بھی تاریخی ارتقا کے فطری اصول کے تابع تھی، اس لیے اس کے سامنے دو امکانات موجود تھے: یا تو وہ اپنی تخلیقی توانائی کھو کر زوال پذیر ہو جاتی، یا نئے سماجی، فکری اور تہذیبی حالات کے مطابق اپنی تشکیلِ نو کرتی۔ چنانچہ جدید اردو نظم نے جمود کا شکار ہونے کے بجائے اپنے اندر تبدیلی، توسیع اور نئے تجربات کو جگہ دی، جس کے نتیجے میں وہ بتدریج مابعد جدید

عہد میں داخل ہوئی۔ یہی مرحلہ اردو نظم کے فکری اور جمالیاتی ارتقا میں ایک اہم موڑ ثابت ہوا۔

گزشتہ ربع صدی کے دوران منظرِ عام پر آنے والی اردو نظم موضوع، ہیئت، اسلوب، زبان اور اظہار کے اعتبار سے اپنے پیش رو ادوار سے نمایاں طور پر مختلف دکھائی دیتی ہے۔ اس دور کے نظم نگار ایک ایسے معاشرتی، سیاسی اور ثقافتی ماحول میں پروان چڑھے جو ان کے پیش رو شعرا کے حالات سے یکسر مختلف تھا۔ اس لیے ان کی شاعری میں زندگی کے نئے تجربات، نئی الجھنیں، شناخت کے مسائل، فرد کی تنہائی، تہذیبی بحران، صارفیت، عالمی سیاست اور جدید ٹیکنالوجی کے اثرات زیادہ شدت کے ساتھ نمایاں ہوئے۔ستر کی دہائی کے اختتام تک عالمی سیاست شدید نظریاتی کشمکش کا شکار تھی۔ دنیا سرمایہ دارانہ اور اشتراکی دو بڑے بلاکوں میں تقسیم تھی، اور یہی تقسیم عالمی سطح پر سرد جنگ (Cold War) کی بنیاد بنی ہوئی تھی۔ اس نظریاتی تصادم کے اثرات صرف سیاست تک محدود نہ رہے بلکہ ادب، ثقافت اور فکری مباحث کو بھی گہرے طور پر متاثر کرتے رہے۔ ادیبوں اور شاعروں کی بڑی تعداد مختلف سیاسی اور نظریاتی وابستگیوں کی حامل تھی، اور ان کی تخلیقات میں ان وابستگیوں کی جھلک واضح طور پر دیکھی جا سکتی تھی۔تاہم اسی کی دہائی کے اختتام پر عالمی منظرنامے میں بڑی تبدیلی رونما ہوئی۔ افغانستان کی جنگ میں سوویت یونین کی ناکامی اور اس کے بعد اشتراکی نظام کے انہدام کو دنیا بھر میں مارکسی نظریے کی شکست کے طور پر دیکھا گیا۔ اس واقعے نے عالمی سیاست ہی نہیں بلکہ ادبی اور فکری حلقوں پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے۔ چنانچہ وہ ادیب اور شاعر جو بائیں بازو کے نظریات سے وابستہ تھے. ان میں سے بہت سے اپنی سابقہ فکری وابستگیوں پر نظرثانی کرنے لگےجبکہ بعض نے نظریاتی مباحث سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہوئے اپنی تخلیقی دنیا کو زیادہ ذاتی، داخلی اور انفرادی تجربات تک محدود کر لیا۔ اس طرح ادب میں نظریاتی شدت رفتہ رفتہ کم ہونے لگی اور تخلیقی اظہار نے نئے موضوعات اور نئے زاویوں کو اپنانا شروع کیا۔

اسی عرصے تک ترقی پسند تحریک بھی اپنی تاریخی اور فکری ذمہ داریاں بڑی حد تک پوری کر چکی تھی۔ اگرچہ اس تحریک کے اثرات مکمل طور پر ختم نہیں ہوئے، لیکن اس کی سابقہ قوت، تنظیم اور فکری شدت باقی نہ رہی۔ اس کے نتیجے میں ادب میں نظریاتی کشمکش کی جگہ فرد کے داخلی

مسائل، شناخت، ثقافتی بحران، وجودی اضطراب اور متنوع سماجی موضوعات نے لینا شروع کر دی، جو مابعد جدید ادب کی نمایاں خصوصیات میں شمار ہوتے ہیں۔

عالمی سطح پر سرد جنگ کے خاتمے کے بعد دنیا ایک حد تک یک قطبی نظام کی طرف بڑھ گئی، جس سے بڑی عالمی طاقتوں کو اپنی سیاسی، معاشی اور عسکری حکمتِ عملی کو زیادہ آزادی کے ساتھ نافذ کرنے کا موقع ملا۔ اس کے نتیجے میں عراق اور افغانستان جیسے ممالک طویل جنگوں اور سیاسی عدم استحکام کا شکار ہوئے۔ دوسری طرف سرمایہ دارانہ نظام اور ملٹی نیشنل کمپنیوں نے عالمی منڈی کو وسعت دی، جس کے باعث صارفیت (Consumerism)اور تجارتی ثقافت نے انسانی زندگی کے تقریباً ہر شعبے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

اسی دوران اطلاعاتی ٹیکنالوجی (Information Technology) اور ذرائع ابلاغ کی بے مثال ترقی نے دنیا کو ایک نئے عالمی گاؤں میں تبدیل کر دیا۔ ڈیجیٹل ذرائع، انٹرنیٹ اور الیکٹرانک میڈیا نے نہ صرف انسانی روابط کی نوعیت تبدیل کی بلکہ سماجی اقدار، تہذیبی رویوں اور اخلاقی تصورات کو بھی متاثر کیا۔ نئی عالمی معیشت میں انسان کی قدر اس کی شخصیت، علم یا کردار کے بجائے اس کی معاشی افادیت اور صارفانہ حیثیت سے متعین ہونے لگی۔ یوں انسان آہستہ آہستہ ایک تجارتی شے (Commodity) میں تبدیل ہوتا محسوس ہونے لگا، اور یہی احساس مابعد جدید اردو نظم کے متعدد شعری تجربات میں نمایاں طور پر جھلکتا ہے۔

پاکستان کے داخلی حالات بھی اس دور میں خاصے پیچیدہ تھے۔ تقریباً چار دہائیوں کے عرصے میں ملک مسلسل تیسرے مارشل لا کے اثرات سے گزر رہا تھا۔ ریاستی جبر، سیاسی عدم استحکام، اظہارِ رائے پر پابندیاں، سنسرشپ اور شہری آزادیوں کی محدود صورتِ حال نے ادبی ماحول کو بھی متاثر کیا۔ اخبارات، رسائل اور دیگر ذرائع ابلاغ سخت نگرانی میں تھے، جس کے باعث ادیبوں اور شاعروں کو اپنے خیالات کے اظہار میں مختلف مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اگرچہ مارشل لا کے خاتمے کے بعد جمہوری نظام بحال ہوا، لیکن سیاسی بے یقینی، سماجی انتشار، معاشی مسائل اور ادارہ جاتی کمزوریوں کی وجہ سے حالات میں بنیادی تبدیلی نہ آ سکی۔ یہی پیچیدہ سماجی، سیاسی اور تہذیبی صورتِ حال معاصر جدید اردو نظم کے مزاج، موضوعات اور

اسلوب کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے اور اسے مابعد جدید عہد کی ایک منفرد ادبی روایت کے طور پر شناخت عطا کرتی ہے۔

اس صورتحال کے حوالے سے ڈاکٹر حامدی کاشمیری معاصر جدید اردو نظم کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "ظاہر ہے کہ نئی نظمیں مختلف النوع (Heterogeneous)تجربات مثلاً محرومی ، آرزو، جنسیت ، انسانی روابط ، بدنی لذت ، فطرت اور ثقافت سے تجدید رشتگی ، خود نگری اور تلاش و جستجو کے رحموں سے روشن ہیں--- ان نظموں سے مترشح ہوتا ہے کہ آج کا شاعر ذات میں سمٹ کر رو جانے کے بجائے کھلی آنکھوں سے باہر کی دنیا کا نظارہ کر رہا ہے، وہ شہری زندگی کی کثافتیں ہوں کہ فطرت کی دلآویزیاں نسلی و گروہی فسادات ہوں کہ فیشن شوز ، کراچی و کشمیر کی خوں ریزیاں ہوں کہ سیاسی جھکنڈے ، انسانی رشتے ہوں کہ تشددکاریاں ، ہر واقع کو دیکھتا ہے اور واردات سے انگیخت ہونے والے تخلیقی عمل کے اظہار کا خواہش مند ہے۔ یہ رویہ دروں بینی کا ابطال نہیں کرتا بلکہ یہ دروں بینی کو جہاں بینی سے مربوط کرتا ہے۔"۔۱

اس طرح جدیدیت سے وابستہ فکری، فنی اور جمالیاتی تصورات معاصر اردو نظم میں ایک نئے اور زیادہ پختہ انداز کے ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں۔ اگرچہ یہ نظم جدیدیت کی روایت سے اپنا تعلق برقرار رکھتی ہے، لیکن اس نے نئے عہد کے تقاضوں کے مطابق اپنی فکری اور فنی تشکیلِ نو بھی کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور کی نظم نہ صرف اپنے موضوعات کے اعتبار سے منفرد ہے بلکہ اسلوب، زبان، علامتوں، استعارات اور اظہار کے پیرائے میں بھی گزشتہ ادوار، خصوصاً مئی کی دہائی تک لکھی جانے والی نظم سے نمایاں طور پر مختلف نظر آتی ہے۔ معاصر نظم کے شاعر نے روایت سے مکمل انقطاع اختیار کرنے کے بجائے اسے نئے تجربات، نئے شعری وسائل اور نئے فکری زاویوں سے ہم آہنگ کیا، جس سے اردو نظم کو ایک تازہ اور عصری شناخت حاصل ہوئی۔اس عہد کے شاعر نے محض جدت کا شور مچانے یا روایتی شعری اظہار کو یکسر مسترد کرنے کے بجائے نہایت خاموشی، شعوری

پختگی اور فنی مہارت کے ساتھ نئے تشبیہی نظام، تازہ استعارات، منفرد علامتوں اور غیر مانوس تلازمات کو اپنی شاعری کا حصہ بنایا۔ اس کے ہاں نئی علامتیں محض فنی آرائش کا ذریعہ نہیں بلکہ عہد کے پیچیدہ تجربات، انسانی احساسات، تہذیبی بحران اور وجودی مسائل کی ترجمان بن کر سامنے آتی ہیں۔ اسی لیے معاصر شاعر اپنے ذاتی اور اجتماعی تجربات کے اظہار کے لیے ایسی نئی زبان تشکیل دیتا ہے جو مروجہ شعری زبان سے مختلف ہونے کے باوجود اپنے عہد کی داخلی کیفیت اور خارجی حقیقت کو پوری شدت کے ساتھ بیان کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

معاصر اردو نظم کا سب سے نمایاں موضوع جدید انسان کا داخلی بحران، روحانی اضطراب اور وجودی بے یقینی ہے۔ یہ بحران بنیادی طور پر اس تیز رفتار معلوماتی اور ڈیجیٹل عہد کی پیداوار ہے، جہاں سائنس، ٹیکنالوجی اور ذرائع ابلاغ نے انسانی زندگی کے ہر پہلو کو متاثر کیا ہے۔ اگرچہ ساٹھ کی دہائی کے نظم نگاروں نے بھی صنعتی معاشرے کے نتیجے میں پیدا ہونے والی تنہائی، اقدار کی شکست و ریخت، مشینی زندگی اور انسان کی بیگانگی کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا تھا، لیکن اس دور کی تنہائی اور موجودہ عہد کی تنہائی میں بنیادی فرق موجود ہے۔ اس زمانے کا انسان اگرچہ صنعتی نظام کے دباؤ کا شکار تھا، تاہم اس کے سماجی رشتے، خاندانی وابستگیاں اور اجتماعی شناخت نسبتاً مضبوط تھیں، جو اسے مکمل داخلی انتشار سے محفوظ رکھتی تھیں۔

اس کے برعکس موجودہ صدی میں کمپیوٹر ٹیکنالوجی، انٹرنیٹ، مصنوعی ذہانت، سیلولر مواصلات، سوشل میڈیا اور الیکٹرانک ذرائع ابلاغ نے انسانی زندگی کو بظاہر تو ایک دوسرے سے جوڑ دیا ہے، مگر حقیقت میں فرد پہلے سے کہیں زیادہ تنہائی، اجنبیت اور نفسیاتی دباؤ کا شکار ہو گیا ہے۔ انسان مسلسل معلومات کے سیلاب میں گھرا ہوا ہے، لیکن اس کے باوجود وہ اپنی ذات، اپنے معاشرے اور اپنی تہذیب سے دور ہوتا جا رہا ہے۔ اس کی اجتماعی شناخت، فکری وابستگیاں، مذہبی و اخلاقی اقدار اور سماجی رویے تیزی سے تبدیل ہو رہے ہیں۔ یوں جدید انسان ایک ایسی دنیا میں رہنے پر مجبور ہے جہاں ظاہری ترقی کے باوجود باطنی سکون، فکری استحکام اور روحانی اطمینان ناپید ہو چکے ہیں۔نتیجتاً فرد اپنے گرد و پیش کے حالات سے مایوس ہو کر اپنی ہی ذات کی طرف رجوع کرتا ہے تاکہ وہاں اسے سکون، شناخت یا معنویت کا کوئی احساس حاصل ہو سکے۔لیکن جب وہ اپنے باطن میں جھانکتا

ہے تو اسے وہاں بھی بے معنویت، محرومی، اضطراب، خوف، تنہائی اور وجودی انتشار کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ یہی داخلی کرب معاصر اردو نظم کا بنیادی حوالہ بن جاتا ہے، جہاں شاعر انسانی نفسیات کے انتہائی باریک اور پیچیدہ گوشوں کو نہایت فنکارانہ انداز میں پیش کرتا ہے۔اس صورتِ حال کو مزید سنگین سرمایہ دارانہ نظام نے بنا دیا ہے۔جس کی بنیاد منافع، استحصال اور صارفیت پر قائم ہے۔ عالمی سرمایہ داری کے مسلسل پھیلاؤ نے انسان کو ایک باوقار فرد کے بجائے محض صارف (Consumer) اور منڈی کی ایک اکائی میں تبدیل کر دیا ہے۔ بڑی تجارتی کمپنیاں اور معاشی ادارے انسان کی شخصیت، اس کے احساسات اور اس کی تخلیقی صلاحیتوں کو ثانوی حیثیت دیتے ہوئے صرف اس کی خریداری کی قوت اور معاشی افادیت کو اہمیت دیتے ہیں۔ اس استحصالی نظام کے ساتھ سیاسی عدم استحکام، آمریت، بدعنوانی، سماجی ناانصافی، قانون کی کمزور عمل داری اور بڑھتی ہوئی بے یقینی نے انسان کے احساسِ تحفظ کو شدید متاثر کیا ہے۔ ان عوامل نے فرد کی زندگی کو مسلسل ذہنی دباؤ، بے بسی اور اضطراب سے دوچار کر دیا ہے۔

یہ پورا منظرنامہ معاصر انسان کو شدید بے چارگی، بے اختیاری اور وجودی بے معنویت کے احساس میں مبتلا کرتا ہے۔ سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ اس کے پاس کوئی مضبوط اخلاقی، روحانی یا فکری سہارا بھی باقی نہیں رہا جو اسے اس بحران سے نجات دلا سکے۔ اگرچہ وہ مغربی سائنسی ترقی، ٹیکنالوجی اور جدید تہذیب کے ساتھ قدم ملا کر چلنے کی کوشش کرتا ہے، لیکن اس دوڑ میں بھی اسے حقیقی اطمینان اور کامیابی حاصل نہیں ہوتی، کیونکہ جدید معاشرہ اس کی روحانی، اخلاقی اور جذباتی ضروریات کو پورا کرنے سے قاصر ہے۔

جب ایک حساس اور باشعور نظم نگار اس پورے عہد کو اپنی تخلیقی بصیرت اور گہری فکری نگاہ سے دیکھتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ موجودہ دور کا انسان اپنی شخصیت کے اعتبار سے ادھورا، منتشر اور بے سمت ہو چکا ہے۔ اس کے اندر نہ تو روایتی ہیرو کی سی قوتِ ارادی، عزم اور حوصلہ باقی رہا ہے اور نہ ہی وہ اپنی کمزوریوں، شکستوں اور محرومیوں کو مکمل طور پر قبول کرنے کی اخلاقی جرأت رکھتا ہے۔ گویا وہ ایک ایسے وجود میں تبدیل ہو گیا ہے جو نہ مکمل طور پر طاقتور ہے اور نہ ہی اپنی بے بسی سے نجات حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہی احساسِ شکست، بے

Liberal Journal of Language & Literature Review
Print ISSN: 3006-5887
Online ISSN: 3006-5895

معنویت، داخلی انتشار اور تہذیبی بحران معاصر اردو نظم کے فکری مزاج اور جمالیاتی تشکیل کی بنیادی اساس بن جاتا ہے۔

مابعد جدید اردو نظم کو صرف ابہام، داخلیت پسندی، لسانی تجربات یا علامتی پیچیدگی تک محدود کر دینا اس کے حقیقی فکری، تاریخی اور سیاسی پس منظر سے صرفِ نظر کرنے کے مترادف ہے۔ اگرچہ مابعد جدید نظم میں زبان، متن، معنی کی کثرت، بین المتونیت، علامت نگاری اور نئے اسلوبیاتی تجربات کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے، لیکن اس کی فکری بنیادیں محض لسانی تشکیلات تک محدود نہیں ہیں۔ درحقیقت مابعد جدید اردو نظم اپنے عہد کے سیاسی، سماجی، ثقافتی اور تہذیبی بحرانوں کا ایک گہرا اور حساس شعری ردِعمل ہے۔ اس نظم کے باطن میں ایسی تاریخی آگہی اور تہذیبی بصیرت کارفرما ہے جو آزادی کے بعد کی ریاست، معاشرے، شناخت، اقتدار اور عالمی طاقتوں کے باہمی تعلقات کو نہایت باریک بینی سے دیکھتی اور ان کا تنقیدی جائزہ لیتی ہے۔

ساٹھ کی دہائی سے لے کر بعد کے عشروں تک اردو نظم میں جو نئے رجحانات ابھر کر سامنے آئے، ان میں انسان کی داخلی شکست، خوف، اضطراب، تنہائی، بے یقینی اور شناختی بحران کو بنیادی موضوعات کی حیثیت حاصل ہوئی۔ بظاہر یہ تمام موضوعات فرد کی نفسیاتی کیفیت سے متعلق محسوس ہوتے ہیں، لیکن حقیقت میں ان کی جڑیں اس مابعد نوآبادیاتی شعور میں پیوست ہیں جو سیاسی آزادی کے باوجود فکری، ثقافتی، معاشی اور نفسیاتی غلامی کے تسلسل کا شدت سے احساس کرتا ہے۔ اگرچہ برصغیر نے نوآبادیاتی اقتدار سے آزادی حاصل کر لی تھی، مگر استعماری نظام کے اثرات ریاستی اداروں، تعلیمی ڈھانچے، زبان، ثقافت، معیشت، سماجی رویوں اور ذہنی ساخت میں مختلف صورتوں میں برقرار رہے۔ یہی احساس مابعد جدید اردو نظم میں ایک گہرے داخلی اضطراب اور تہذیبی بے چینی کی صورت اختیار کرتا ہے۔اسی تناظر میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مابعد جدید اردو نظم کو مابعد نوآبادیاتی تنقید کے زاویے سے پڑھنا نہایت اہم ہے، کیونکہ اس سے نظم کے ان پوشیدہ معانی تک رسائی حاصل ہوتی ہے جو محض اسلوبیاتی یا لسانی مطالعے سے سامنے نہیں آتے۔ مابعد نوآبادیاتی نظریہ اس امر پر زور دیتا ہے کہ آزادی کے بعد بھی استعماری قوتیں اپنے سیاسی، معاشی، ثقافتی اور فکری اثرات مختلف صورتوں میں برقرار رکھتی ہیں۔ چنانچہ مابعد جدید اردو نظم

میں عالمی سامراجی عزائم، سرمایہ دارانہ غلبہ، تہذیبی یلغار، ثقافتی استحصال، صارفیت، شناخت کے بحران، داخلی استعمار، طاقت کے غیر مساوی ڈھانچوں اور سماجی ناانصافی جیسے موضوعات نمایاں حیثیت اختیار کر جاتے ہیں۔ یہ تمام عناصر اس نظم کو محض ذاتی احساسات کا اظہار نہیں رہنے دیتے بلکہ اسے اپنے عہد کی اجتماعی تاریخ اور تہذیبی شعور کی دستاویز بنا دیتے ہیں۔

عالمگیریت (Globalization) اور صارفی کلچر (Consumer Culture)کے فروغ نے بھی مابعد جدید اردو نظم کے موضوعات اور اسلوب کو گہرے طور پر متاثر کیا۔ جدید سرمایہ دارانہ نظام نے انسان کو آہستہ آہستہ ایک ایسے صارف میں تبدیل کر دیا جس کی شناخت اس کی فکری یا اخلاقی اقدار کے بجائے اس کی معاشی حیثیت اور خریداری کی صلاحیت سے متعین ہونے لگی۔ ذرائع ابلاغ، اشتہارات، ملٹی نیشنل کمپنیوں اور ڈیجیٹل ثقافت نے انسانی شعور کو اس حد تک متاثر کیا کہ فرد اپنی تہذیبی جڑوں، ثقافتی شناخت اور اجتماعی اقدار سے دور ہوتا چلا گیا۔ مابعد جدید اردو نظم نے اس صورتِ حال کو نہایت حساس انداز میں محسوس کیا اور اسے علامتوں، استعاروں، تمثیلوں اور پیچیدہ شعری پیکروں کے ذریعے بیان کیا۔اس دور کے نظم نگاروں نے داخلی استعمار (Internal Colonialism) کی ان صورتوں کی بھی نشاندہی کی جو سیاسی آزادی کے بعد قومی ریاستوں کے اندر مختلف شکلوں میں وجود میں آئیں۔ اقتدار کی مرکزیت، آمریت، ریاستی جبر، طبقاتی تفریق، سماجی ناانصافی، اظہارِ رائے پر پابندیاں، نسلی و لسانی امتیازات اور طاقت کے غیر منصفانہ ڈھانچے ان کی شاعری میں بار بار موضوع بنتے ہیں۔ یوں ان کی نظم فرد کے داخلی دکھ سے آگے بڑھ کر پورے معاشرے کے اجتماعی زخموں اور تہذیبی بحران کی نمائندگی کرتی ہے۔

افتخار جالب، انیس ناگی، سلیم احمد، کشور ناہید، فہمیدہ ریاض، ثروت حسین اور ان کے معاصر شعرا کی تخلیقات اس حوالے سے خصوصی اہمیت رکھتی ہیں۔ ان شعرا نے اپنے عہد کے سیاسی استبداد، سماجی ناہمواری، ثقافتی شکست و ریخت، عورت کے استحصال، شناخت کے بحران، ریاستی جبر، عالمی سامراجی پالیسیوں اور سرمایہ دارانہ نظام کے منفی اثرات کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ ان کے ہاں مزاحمت محض سیاسی نعرہ نہیں بلکہ ایک گہرا تہذیبی، فکری اور جمالیاتی رویہ ہے، جو انسانی وقار، آزادی اور شناخت کے تحفظ کی جدوجہد سے عبارت ہے۔چنانچہ مابعد جدید اردو نظم کو صرف انفرادی کرب، نفسیاتی الجھن یا لسانی تجربے کی شاعری قرار دینا اس

کی معنوی وسعت اور فکری گہرائی کو محدود کر دینے کے مترادف ہوگا۔ درحقیقت یہ نظم اپنے عہد کے اجتماعی لاشعور، تہذیبی بحران، تاریخی یادداشت اور ثقافتی مزاحمت کی نمائندہ آواز ہے۔ اس میں فرد کی بے بسی کے ساتھ پوری تہذیب کے دکھ، شکست، اضطراب اور آزادی کی آرزو سمٹ آئی ہے۔ اسی لیے مابعد جدید اردو نظم ایک ایسی تخلیقی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے جو نہ صرف اپنے عہد کے سیاسی، سماجی اور ثقافتی حالات کی گواہی دیتی ہے بلکہ ان حالات سے نجات، مزاحمت اور نئے انسانی امکانات کی تلاش کا شعری استعارہ بھی بن جاتی ہے۔

مابعد جدید اردو نظم کے شعرا نے عالمی سطح پر ابھرنے والی سامراجی قوتوں کی نوآبادیاتی پالیسیوں اور ان کے زیرِ اثر تشکیل پانے والے **"نیو ورلڈ آرڈر (New World Order)** "کو اپنی تخلیقات میں شدید تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ ان کے نزدیک اگرچہ روایتی نوآبادیاتی نظام بظاہر اپنے اختتام کو پہنچ چکا ہےلیکن استعمار نے نئے سیاسی، معاشی، ثقافتی اور فکری طریقۂ کار اختیار کر کے اپنی بالادستی کو برقرار رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مابعد جدید نظم میں استعماری طاقتوں کے ان نئے حربوں کو مختلف علامتوں، استعاروں اور تمثیلات کے ذریعے آشکار کیا گیا ہے۔ ان شعرا کا خیال ہے کہ عالمی طاقتیں اپنی سیاسی برتری، معاشی اجارہ داری اور ثقافتی غلبے کے ذریعے تیسری دنیا کے ممالک کی قومی خودمختاری، تہذیبی شناخت، معاشی آزادی اور فکری استقلال کو کمزور کرنے کی مسلسل کوشش کر رہی ہیں۔ اس عمل کے نتیجے میں مقامی معاشرے نہ صرف اقتصادی انحصار کا شکار ہوتے ہیں بلکہ ان کی زبان، ثقافت، روایات اور تہذیبی اقدار بھی بتدریج زوال پذیر ہونے لگتی ہیں۔مابعد جدید نظم نگار اس حقیقت کی طرف توجہ دلاتے ہیں کہ جدید استعمار صرف عسکری طاقت یا براہِ راست قبضے کے ذریعے کام نہیں کرتا بلکہ میڈیا، عالمی سرمایہ داری، کثیر القومی کمپنیوں، بین الاقوامی مالیاتی اداروں، اطلاعاتی ٹیکنالوجی اور ثقافتی یلغار کے ذریعے اپنی گرفت مضبوط بناتا ہے۔ اس نئی صورتِ حال میں انسان کی فکری آزادی، تہذیبی شناخت اور ثقافتی خودمختاری شدید خطرات سے دوچار ہو جاتی ہے۔ یہی احساس مابعد جدید اردو نظم کے متعدد شعری متون میں مختلف علامتی اور استعاراتی صورتوں میں نمایاں ہوتا ہے۔

افتخار جالب کی نظم **"زیست کا کوڑا ملیا "**اسی عالمی استحصالی نظام کے خلاف ایک مؤثر اور بامعنی احتجاج کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس نظم میں

شاعر عالمی سامراجی قوتوں کی بڑھتی ہوئی مداخلت اور سرمایہ دارانہ نظام کے پھیلاؤ کے نتیجے میں تیسری دنیا کے معاشروں میں رونما ہونے والی تہذیبی اور اخلاقی تبدیلیوں کو نہایت گہرے شعری شعور کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ شاعر کے مطابق عالمی سرمایہ داری نے صارفیت (Consumer Culture)کو اس حد تک فروغ دیا ہے کہ انسانی اقدار، اخلاقی روایات، سماجی تعلقات اور تہذیبی شناخت منڈی کی معیشت کے تابع ہو کر رہ گئے ہیں۔ انسان کی اصل شناخت اس کی شخصیت، کردار یا تہذیبی وابستگی کے بجائے اس کی خرید و فروخت کی صلاحیت اور معاشی افادیت سے متعین ہونے لگی ہے۔افتخار جالب اس صورتِ حال کو محض ایک معاشی تبدیلی نہیں سمجھتے بلکہ اسے تہذیبی اور فکری بحران قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک مغربی صارفی ثقافت کی یلغار نے مشرقی معاشروں کی اخلاقی اقدار، روحانی روایات اور ثقافتی تشخص کو شدید نقصان پہنچایا ہے۔ مقامی زبانیں، روایتی رسوم، ادبی ورثہ اور تہذیبی شناخت رفتہ رفتہ اپنی اصل صورت کھوتے جا رہے ہیں، جبکہ مغربی طرزِ زندگی، تجارتی ثقافت اور منڈی کی اقدار معاشرتی زندگی پر غالب آتی جا رہی ہیں۔ اس طرح شاعر اپنی نظم میں اس عالمی نظام کی ایک ایسی تصویر پیش کرتا ہے جس میں طاقتور اقوام کمزور ممالک کے وسائل، ثقافت اور فکری آزادی پر بالواسطہ قبضہ جما کر انہیں اپنی معاشی اور تہذیبی پالیسیوں کا تابع بنانے کی کوشش کرتی ہیں۔اسی تناظر میں شاعر اپنی نظم کے ذریعے قاری کو اس حقیقت کا احساس دلاتا ہے کہ اگر اس ثقافتی اور معاشی استعمار کا بروقت ادراک نہ کیا گیا تو تیسری دنیا کی اقوام اپنی تہذیبی شناخت، فکری آزادی اور ثقافتی خودمختاری سے محروم ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ **"زیست کا کوڑا ملیا "**صرف ایک احتجاجی نظم نہیں بلکہ مابعد نوآبادیاتی شعور، تہذیبی مزاحمت اور ثقافتی بقا کی ایک اہم شعری دستاویز کے طور پر سامنے آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ نظم معاصر اردو شاعری میں عالمی سامراج، صارفیت اور ثقافتی استعمار کے خلاف مزاحمتی فکر کی ایک نمایاں مثال سمجھی جاتی ہے۔ملاحظہ ہو۔

شیر بکری کے نئے گھاٹ کے
دروازے، آرے
ورلڈ آرڈر کے بہیمانہ طلسمات نے
ڈیرے ڈارے
ہم تہی دست تو پہلے ہی سے تھے ،
دیکھیے مشروم فشن

Liberal Journal of Language & Literature Review
Print ISSN: 3006-5887
Online ISSN: 3006-5895

شیر وشکر ہوتی زبانوں کا بطن،
قربت ولاچاری کالنگوا کلچر
--- تاحد نگاہ زیست کا کوڑا ملبہ
ہیروشیما کے دم عیسیٰ کا ہر لحظہ نیا
کن فیکون ! ۔۲

معاصر اردو نظم میں تنہائی، بے بسی اور داخلی اضطراب کا احساس محض ایک فنی اظہار نہیں بلکہ جدید عہد کی حقیقی سماجی اور نفسیاتی صورتِ حال کی عکاسی ہے۔ ٹیکنالوجی کے فروغ اور انسانی تعلقات کی کمزوری نے فرد کو پہلے سے زیادہ تنہا اور منتشر کر دیا ہے۔ عالمی سطح پر سیاسی عدم استحکام، خوف اور غیر یقینی صورتِ حال نے بھی انسان کے ذہنی اور نفسیاتی بحران کو مزید گہرا کیا ہے۔ اسی لیے معاصر اردو نظم نگار، یورپی شعرا کی طرح، دروں بینی اور باطنی تجربات کی طرف متوجہ ہوئے ہیں۔ انہوں نے خارجی حالات کو داخلی احساسات کے ساتھ ہم آہنگ کر کے پیش کیا ہے، جس کے باعث اجتماعی مسائل بھی ذاتی کرب کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ شاعر اپنے عہد کے دکھ، اضطراب اور بے بسی کو اس شدت سے بیان کرتا ہے کہ وہ اس کے اپنے ذاتی تجربے کا حصہ محسوس ہوتے ہیں۔

ہم نے اپنے بچپن میں
جو بھی خواب دیکھے تھے
چھوٹے چھوٹے جسموں پر
پورے پورے آتے تھے
عمر نے ہمارے قد
اب بڑھا دیے لیکن
آج بھی وہ پیرا ہن
ہم بدل نہیں پائے۔۔ ۳

آج کا شاعر معلوماتی اور میڈیا کے غلبے والے عہد میں زندگی بسر کر رہا ہےجہاں کائنات کے بہت سے پوشیدہ اسرار مسلسل آشکار ہو رہے ہیں اور ذرائع ابلاغ کے ذریعے فوراً اس کے شعور کا حصہ بن جاتے ہیں۔ اس صورتِ حال نے تخلیقی عمل کو مزید پیچیدہ کر دیا ہےکیونکہ اسرار اور تجسس کی وہ فضا کم ہوتی جا رہی ہے جو تخلیقی تحریک کا باعث بنتی ہے، جبکہ عصری شعور کا اضطراب شاعر کو مسلسل بے چین رکھتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنے خارجی مشاہدات اور داخلی بے چینی کو آزادانہ تخیل کے ذریعے ایک خواب

ناک اور علامتی کیفیت میں ڈھال دیتا ہے۔ انیس ناگی کی نظم **"روشنیاں "**اسی کیفیت کی عمدہ مثال ہے۔

کہ تیسری دنیا بھوک، پیاس اور
ناداری کا خطہ ، شمال سے اترتی
سفید فام
نسل کی برتری کے کمالات سے
مرعوب ، ان کے علوم کو فروغ دیتا
ہوا اپنے نشانات
شناخت سے محروم رہے گا۔
اوہ، ان کی تاریخ محکومی میں ہے ،
وہ ایک دوسرے سے متصادم۔۔۔ اوہ وہ
مہذب
دریوزہ گر جن کی کشکول کا پیٹ
پھول چکا ہے،
اور جن کی عورتیں نسل کشی سے
عاجز اور جن کی اولاد زر کی تلاش
میں
نت نئے فتنے جگار ہی ہے
اس کہرام میں اس ابتری میں دیدہ و
دل کے سب قرینے مسمار ہو چکے
ہیں" ۔۴

اس نظم میں شاعر تیسری دنیا کے عوام کے ساتھ ہونے والی ناانصافی اور سامراجی استحصال پر احتجاج کرتا ہے۔ وہ سفید فام نسل کی ثقافتی برتری اور علمی اجارہ داری کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے قرار دیتا ہے کہ نوآبادیاتی نظام نے ایشیائی معاشروں کو علمی، ثقافتی اور سماجی طور پر کمزور کر دیا۔ بیرونی قرضوں اور معاشی انحصار نے عوام کو محکومانہ زندگی پر مجبور کیا، جبکہ مسلط کردہ تہذیب نے معاشرتی انتشار اور باہمی کشمکش کو مزید بڑھایا۔ سلیم احمد اپنی نظم **"مشرق ہار گیا "**میں اسی صورتِ حال کی عکاسی کرتے ہیں۔

یہ بکسر اور پلاسی کی ہار نہیں ہے
ٹیپو اور جھانسی رانی کی ہار نہیں
ہے
سن ستاون کی جنگ آزادی کی ہار
نہیں ہے

ایسی ہار تو جیتی جا سکتی ہے (شاید
ہم نے جیت بھی لی ہے)
لیکن مشرق اپنی روح کے اندر ہار
گیا ہے۔۵

اس نظم میں شاعر تیسری دنیا کے عوام کے ساتھ ہونے والی ناانصافی اور سامراجی استحصال پر احتجاج کرتا ہے۔ وہ سفید فام نسل کی ثقافتی برتری اور علمی اجارہ داری کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے قرار دیتا ہے کہ نوآبادیاتی نظام نے ایشیائی معاشروں کو علمی، ثقافتی اور سماجی طور پر کمزور کر دیا۔ بیرونی قرضوں اور معاشی انحصار نے عوام کو محکومانہ زندگی پر مجبور کیا، جبکہ مسلط کردہ تہذیب نے معاشرتی انتشار اور باہمی کشمکش کو مزید بڑھایا۔ سلیم احمد اپنی نظم **"مشرق ہار گیا "**میں اسی صورتِ حال کی عکاسی کرتے ہیں۔

ایٹمی دور میں فطرت کا اصل حسن اور چہرہ شدید متاثر ہو چکا ہے۔ شاعر فطرت سے ہم آہنگی کی خواہش کے باوجود اس کے حقیقی حسن کی بازیافت کو مشکل محسوس کرتا ہے۔ چنانچہ وہ ان عوامل پر توجہ مرکوز کرتا ہے جنہوں نے فطرت کو تباہ کیا، اور پرندوں سے اظہارِ افسوس کرتا ہے، جو فطرت سے ہم آہنگی اور آزادی کی نمایاں علامت سمجھے جاتے ہیں۔روش ندیم ان حالات پر ایسے نوحہ کناں ہیں۔

پرند و! در گزر کرنا
کہ جب سے شہر کے لوگوں نے
اپنے سائبانوں کے لیے خود چھتریاں
ایجاد کر لی ہیں
وہ کہتے ہیں
ہمیں پیڑوں کی چھاؤں
یا تمہارے گھونسلوں سے کیا ؟
ہمیں تو جون کے سورج بھی اب کچھ
کہہ نہیں سکتے
ہم اک کمزوری شے ہے
ذراسی آکسیجن مانگنا ذات سمجھتے
ہیں
پرندو !در گزر کرنا
تم اہل دل ہو

پیروں سے ابھی تک پیار کی رسمیں
نبھاتے ہو۔٦

اس طرح نصیراحمدناصراپنی نظم "بارش کیسے لائیں "میں کہتے ہیں کہ

جھیلیں ہوگئیں خالی
سوکھے جنگل بیلے
پنچھی،ڈھور،درندے
تتلیاں ،سانپ،مکوڑے
انساں زندہ ڈھانچے
جل بن دردکےسانچے
آنکھیں خشک دراڑیں
بنجرخواب سرائیں
بارش کیسے لائیں۔٧

یوں مجموعی طورپرکہاجاسکتاہے کہ مابعد جدید اردو نظم کا نوآبادیاتی تناظر اس حقیقت کو نمایاں کرتا ہے کہ سیاسی آزادی کے حصول کے باوجود نوآبادیاتی اثرات ذہنی، ثقافتی، معاشی اور تہذیبی سطح پر مکمل طور پر ختم نہیں ہوئے۔ مابعد جدید نظم نگاروں نے اپنے عہد کے انسان کے داخلی اضطراب، شناختی بحران، تہذیبی بیگانگی، سیاسی جبر، معاشی استحصال اور صارفیت کو محض ذاتی مسائل کے طور پر پیش نہیں کیا بلکہ انہیں نوآبادیاتی ورثے اور عالمی طاقت کے نئے نظام سے مربوط کیا ہے۔ عالمی سامراج، ثقافتی اجارہ داری، مغربی تہذیبی غلبے، سرمایہ دارانہ صارفیت، داخلی استعمار اور ذرائع ابلاغ کی یلغار نے جس طرح فرد اور معاشرے کی شناخت کو متاثر کیا، اس کی گہری بازگشت مابعد جدید نظم میں سنائی دیتی ہے۔ اس نظم میں مشرق کی شکست صرف سیاسی یا معاشی شکست نہیں بلکہ زبان، ثقافت، اقدار، تاریخ اور اجتماعی حافظے کے بحران کی صورت میں بھی سامنے آتی ہے۔ تاہم مابعد جدید شاعر محض نوحہ گری تک محدود نہیں رہتا بلکہ اپنی شعری بصیرت کے ذریعے جبر کے ان تمام نظاموں کو بے نقاب کرتا اور انسانی آزادی، ثقافتی خودمختاری اور شناخت کی بازیافت کی خواہش کو اظہار دیتا ہے۔ یوں مابعد جدید اردو نظم ایک طرف نوآبادیاتی ماضی کے تسلسل اور اس کے نئے مظاہر کی نقاب کشائی کرتی ہے تو دوسری طرف مزاحمت، خود آگہی اور تہذیبی بقا کی نئی راہیں تلاش کرتی ہے۔ اسی اعتبار سے اسے ایک ایسی شعری دستاویز قرار دیا جا سکتا ہے جو فرد کے داخلی

کرب کو پوری تہذیب کے اجتماعی تجربے سے جوڑتے ہوئے مابعد نوآبادیاتی عہد کی پیچیدہ سیاسی، سماجی اور ثقافتی حقیقتوں کی مؤثر ترجمانی کرتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ڈاکٹرحامدکشمیری،مابعدجدید نظم،مشمولہ ،ادب کابدلتامنظرنامہ اورمابعدجدیدیت پرمکالمہ،سنگ میل پبلی کیشنزلاہور،۲۰۰۰ء،ص۲۲۴

۲۔ افتخار جالب، یہی ہے میرا لحن، ملٹی میڈیا افئیرز، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص ۹۰

۳۔انوار فطرت ،اب ہم کارٹون دکھائی دیتے ہیں ، مشمولہ اداس لڑکی،فکشن ہاوس لاہور،۲۰۰۹ء،ص۲۱۳

۴۔ انیس ناگی، بیگانگی کی نظمیں، تخلیقات پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۰ء، ص ۲۴۸

۵۔ سلیم احمد، کلیاتِ سلیم احمد، الحمرا پبلشنگ ہاوس، اسلام آباد، ۲۰۰۳ء، ص ۳۷۹

۶۔روش ندیم،ایک خط پرندوں کے نام،مشمولہ دہشت کےموسم میں لکھی نظمیں ،مکتبہ جدیدلاہور،۲۰۱۴ء،ص ۷۸

۷۔ نصیراحمدناصر،"بارش کیسے لائیں "مشمولہ،پانی میں گم خواب،تسطیرپُبلشرزلاہور،۲۰۰۲ء،ص۱۰۲